قرآن حکیم اور اصلاحِ معاشرہ

جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن
چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی دس سالہ تقریبِ تاسیس کے ضمن میں ۱۲ نومبر بروز جمعہ بعد نمازِ مغرب جناح ہال، لاہور میں "اصلاح معاشرہ اور قرآنِ حکیم" کے موضوع پر ایک مجلسِ مذاکرہ بصدارت جناب مولانا سید وصی مظہر ندوی مہتمم جامعہ اسلامیہ دمیر حیدرآباد منعقد ہوئی تھی۔ اس مجلس کے مہمانِ خصوصی جناب جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب تھے اور موصوف نے حسبِ ذیل مقالہ اس مجلس میں پیش کیا تھا ——— (ادارہ)

انسان جس معاشرے میں رہتا ہے۔ یقیناً اس کی اصلاح کا فریضہ بھی خود اس پر عائد ہوتا ہے۔ گو اصول یہی ہے کہ ہر فرد اپنے افعال کا خود ذمہ دار اور جوابدہ ہے لیکن معاشرہ کے جو افراد نہ صرف خود با اختیار ہیں بلکہ بعض دوسرے افراد پر بھی بعض اعتبار سے اختیار رکھتے ہیں ان کی ذمہ داری دوہری ہو جاتی ہے۔ ایک خود اپنی ذات کے بارے میں اور دوسری متعلقہ افراد کے تعلق سے۔ مثال کے طور پر والدین اپنی اولاد کی اِصلاح و تربیت کے ذمہ دار ہیں۔ استاد اپنے شاگردوں کی اِصلاح و تربیت کے ذمہ دار ہیں۔ ایک حاکم اپنی رعایا کے عام اخلاق کی درستی اور اِصلاح و تربیت کا ذمہ دار ہے۔ اسی لئے قرآنِ پاک میں ارشاد ہوتا ہے "قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا" یا "اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ" کہ خود اپنے آپ اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ یا اسی طرح یہ کہ اپنے اہلِ خاندان، عزیز و اقارب کو عذابِ دوزخ سے ڈراؤ۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے: کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ کہ تم میں سے ہر ایک گلہ بان یعنی نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک جوابدہ ہے اپنے گلہ کے بارے میں

اسلام معاشرے کی اِصلاح کو دو دائروں میں بیان کرتا ہے۔ ایک انفرادی سطح پر اور دوسرے اجتماعی سطح پر۔ چنانچہ اگر ایک طرف انسان کے ذمہ خود اپنی اصلاح ہے تو دوسری

طرف اس کے ذمہ معاشرہ کے دیگر افراد کی اصلاح کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ البتہ ایک خاص دائرہ میں یہ فریضہ مسلمانوں کے ایک گروہ کے سپرد ہے کہ وہ "داعی الی الخیر" ہو کر لوگوں کو خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ ان کی اصلاح و تربیت کے کام میں مشغول رہیں۔

قرآن کا مقصود یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی ہر دو دائروں میں اصلاحِ معاشرہ کے کام میں مشغول رہا جائے۔ اس کے لئے اگر علیحدہ وقت نہ مل سکے تو جس کام اور پیشے سے متعلق ہے اس میں خیر و اصلاح کے پہلو نکال کر نیکیوں کو پھیلاتا رہے۔ اللہ برکت دینے والا ہے۔ چنانچہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کے لئے اگر قرآنی ہدایات پر عمل کیا جائے اور خود کو بھی لوگوں کے سامنے عملی نمونہ بنا کر پیش کیا جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کے اچھے اور مفید اثرات مرتب ہوں گے اور اصلاحِ معاشرہ کا کام مستحکم بنیاد اختیار کر سکتا ہے۔

قرآنِ حکیم توحید و رسالت اور عقیدہ آخرت کو اصلاحِ معاشرہ کے لئے سنگِ بنیاد کی حیثیت دیتا ہے۔ خاص طور پر عقیدۂ آخرت انسان کے بنیادی اعمال و افعال پر جس طرح اثر انداز ہوتا ہے، اس کا مقابلہ کوئی اور نظریہ یا عقیدہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا

"جس نے نیک کام کیا تو اس کا فائدہ اس کے اپنے لئے ہے اور جس کسی نے برائی کی وہ خود اس کے آگے آئے گی"

آخرت پر ایمان انسان کی سیرت و کردار کی تشکیل کی بنیاد اور اصلاحِ معاشرہ کے لئے تریاق کا کام کرتا ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے لئے صرف یہی دنیا اصل مقصود ہے اور ان کے پاس آخرت کا کوئی تصور موجود نہیں، وہ "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے مصداق اس چند روزہ حیات کو اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں۔ آخرت کی جزا و سزا کا کوئی تصور ان کے یہاں موجود نہیں۔ ان کو معاشرتی برائیوں اور اخلاقی جرائم کے ارتکاب سے باز رکھنے والی کوئی شے نظر نہیں آتی۔ اور اگر وہ کسی وقت ان برائیوں اور جرائم کے ارتکاب سے رُکے رہتے ہیں تو ایسا حکومت کے تحریری قوانین یا سوسائٹی کے اخلاقی دباؤ

کے تحت ہوتا ہے لیکن " چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند " کے مصداق خلوتوں اور رازدارانہ طریقوں پر جہاں حکومت اور پولیس کا انہیں کوئی خدشہ نہیں، انہیں کون سا امر مجبور کر سکتا ہے کہ وہ اپنے عیش و آرام اور مالی مفادات اور مادی منافع کو چھوڑ کر اخلاقی قدروں اور ضابطوں کی پابندی قبول کریں؟ وہ صرف عقیدۂ آخرت اور اللہ کا خوف ہی ہو سکتا ہے جو انسان کو اس کے ظاہر و باطن میں یکساں اخلاقی عمل اختیار کرنے پر اس کے قلب و ضمیر کو ہمہ وقت آمادہ و تیار رکھتا ہے۔

اس کیفیت کو اس مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک شخص تن تنہا ایک جنگل میں جا رہا ہے کہ راستے میں اسے ایک تھیلی پڑی ملتی ہے وہ اٹھا لیتا ہے۔ کھول کر دیکھتا ہے کہ وہ تھیلی کرنسی نوٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس کے آس پاس کوئی فرد بشر موجود نہیں جو اس فعل کا گواہ ہو، تھیلی پر مالک کا پتہ بھی لکھا ہے۔ لیکن وہ خدا فراموش شخص اس تھیلی کو اٹھا کر خوشی خوشی اپنے گھر لے جاتا ہے اور خوب گل چھرّے اڑاتا ہے۔ اس کے برخلاف عقیدۂ آخرت پر ایمان رکھنے والا شخص جو اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے تمام کاموں سے واقف ہے اور وہ ہماری تمام حرکات و سکنات کو دیکھ رہا ہے۔ اس نے ہمارے تمام افعال کے لکھنے کے لئے کراماً کاتبین مقرر کر رکھے ہیں۔ جو ہمارے ہر عمل کو لکھ رہے ہیں۔ ایسا شخص یا تو اس تھیلی کو وہیں پڑا رہنے دے گا یا اس کے مالک کو تلاش کر کے اس تک اس تھیلی کو پہنچا دے گا یا حکومت کے پاس جمع کرا دے گا۔ ان دونوں اشخاص کے درمیان نقطۂ امتیاز صرف عقیدۂ آخرت پر کامل ایمان ہے۔ یہی وہ عقیدہ تھا جس پر پوری طرح عمل کرنے سے اسلام کے ابتدائی دور میں ایسا پاکیزہ معاشرہ وجود میں آیا کہ لوگ مسلمانوں کی صورتیں اور چال چلن دیکھ کر دل و جان سے اسلام کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔

اسلام معاشرے کی اصلاح کے لئے علم دین کے عمومی پہلو کو عام کرنے پر خاص زور دیتا ہے کیونکہ دین کا اصل مقصد بندہ اور اللہ کے درمیان تعلق کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنا ہے۔ جس پر انسان کی عملی زندگی کی صحیح صورت گری کا دار و مدار ہے۔ اسلام صحیح سمت میں دل میں جذبۂ عمل کو بیدار کر کے یہ احساس اجاگر کرتا ہے کہ انسان اچھے اعمال کرے، معاشرے کے دوسرے افراد کو تکلیف نہ پہنچائے، دوسروں کے حقوق غصب نہ کرے۔ دوسروں

کے حقوق غصب کرنے کے لئے جھوٹے مقدمات نہ دائر کرے۔ جھوٹی گواہی نہ دے۔ اللہ اور اس کے رسول برحق کے فرمان کے خلاف حرام مال کھانے میں نہ لگے۔ دنیا کے ذلیل اور پست مقاصد کے حصول کے لئے شریعت کے خلاف طریقے اختیار نہ کرے۔

قرآن حکیم ایمان و عمل کو لازم و ملزوم قرار دیتا ہے۔ ایمان قلب سے شروع ہوتا ہے۔ اور عمل تک پہنچ کر مکمل ہوتا ہے۔ ورنہ ناقص رہتا ہے۔ ایمان و عمل کا یہ التزام معاشرے کی پاکیزگی کا ضامن ہوتا ہے۔

اور یوں بھی یہ بات ماہرین عمرانیات اور نفسیات کے نزدیک مسلّم ہے کہ انسان کے افعال و اعمال کا اصل محرک اس کے خیالات ہوتے ہیں۔ اگر خیالات صالح ہیں تو ان کے زیر اثر جو افعال سرزد ہوں گے وہ بھی نیک اور صالح ہوں گے۔ اور اگر خیالات برے اور فاسد ہیں تو افعال اور اعمال بھی برے ہوں گے۔ اور یہ بات بھی ہم سب کو تسلیم ہے کہ خیالات کا مبدأ اور سرچشمہ دراصل اس کے عقائد ہوتے ہیں۔ جن کے تحت اس کے خیالات و تصورات تشکیل پاتے ہیں۔ اب اگر عقیدہ صالح ہو تو اس کی زندگی کے افعال و اعمال اس عقیدہ کے زیر اثر وقوع پذیر ہوں گے۔ چنانچہ عمل کی اصل ایمان ہے۔

ایمان کا بنیادی نکتہ اللہ کے وجود کو اس کی تمام صفات کے ساتھ تسلیم کرنا، احکم الحاکمین ماننا اور پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو خدا کا آخری پیغمبر ماننا اور عملاً آپ کے دین کو اپنی ساری زندگی میں جاری و ساری اور غالب کرنا ہے۔ اللہ کو احکم الحاکمین ماننے والا شخص کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا۔ اللہ کو قادر مطلق ماننے والا شخص کسی شخص کو نفع و ضرر کا مالک نہیں سمجھتا۔ اللہ کو رازق حقیقی ماننے والا شخص یقین رکھتا ہے کہ دنیا میں کوئی ذی روح ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو سچا اور آخری نبی ماننے والا آپ کو ایک ماڈل اور نمونہ سمجھتا ہے اور اپنی زندگی آپ ہی کے بتائے ہوئے طریقے پر گذار کر دنیاوی برکات و حسنات حاصل کرتا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی قائم کردہ نماز کو قائم کرتا ہے۔ زکوٰۃ کے نظام کو اپنا کر حبِّ مال کے مرض میں مبتلا نہیں ہوتا۔ باہمی ہمدردی اور ضرورت مندوں کی مدد کے جذبۂ عمل کو پروان چڑھاتا ہے اور روزہ دوسروں کی غربت اور بھوک کا احساس دلاتا ہے۔ اور ایمان کی سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ ایمان کامل انسان کو اس دنیاوی زندگی میں معصیت و گناہ سے بچاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جو شخص گناہ و معصیت سے

بچتا ہے اس کی یہ دنیاوی زندگی امن و عافیت کا گہوارہ ہوتی ہے اور دنیا میں انسانی زندگی کے لئے جو مضر چیزیں ہیں وہ ان سے محفوظ رہتا ہے اور اللہ کی قائم کردہ حلال و حرام کی حدود کو قائم رکھ کر اس دنیا میں نفس مطمئنہ حاصل کرتا ہے۔ وہ ایمان کی روشنی میں زندگی کی کٹھن راہوں پر صبر و استقلال کے ساتھ چلنے کا سبق سیکھتا ہے کیونکہ اس کا ایمان ہوتا ہے کہ اس دنیا کا ناظم حقیقی اللہ ہے جس کی مشیت کے بغیر اس دنیا کا کوئی ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ وہ راضی بہ رضائے الٰہی ہو کر زندگی گزارنے کا سلیقہ جان جاتا ہے اور اس دنیاوی زندگی میں پستی یا محرومی کا احساس اسے جادۂ مستقیم سے نہیں ہٹا سکتا۔

ایک صاحبِ ایمان و ادراک شخص جنگ و امن، معیشت و سیاست اور تعلیم و ثقافت کے بارے میں سارے فیصلے ایمان کی روشنی میں کرتا ہے۔ آخرت میں جواب دہی کا تصور اسے دنیا میں انسانوں کے حقوق غصب کرنے سے روکتا ہے۔ اگر عقیدۂ آخرت نہ ہو اور جزا و سزا پر ایمان نہ ہو تو محض دنیاوی قوانین انسانوں کو باہم متحد اور ان میں اخوت و ہمدردی پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ انسانیت کی عالم گیر فلاح ہی ایمان پر ہے۔ ایمان ہی کے ذریعہ انسان کو اپنی ہستی اور اس کے مقام کا صحیح ادراک حاصل ہوتا ہے اور اس کے مقصدِ وجود اور دائرہ کار کا تعین ہوتا ہے جس پر عمل پیرا ہو کر اس پر نہ صرف دنیاوی برکات کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ بلکہ ایسے ہی بندوں کے لئے قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي	"اے نفسِ مطمئنہ! تو اپنے رب کی طرف
إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي	راضی برضا ہو کر رجوع کر اور میرے
فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي	بندوں میں شامل ہو کر میری جنت میں
(پارہ ۳۰، سورۂ فجر، آیت نمبر ۲۷)	داخل ہو جا۔"

اصلاحِ معاشرہ کے لئے قرآنِ حکیم جس چیز پر زیادہ زور دیتا ہے وہ قول و فعل میں توافق (موافقت) و مطابقت ہے۔ فی زمانہ ہمارے یہاں اصلاحِ معاشرہ کی جو کوششیں کی جاتی ہیں ان کی ناکامی یا بہت کم کامیابی کی ایک خاص وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہمارے قول و فعل میں مطابقت نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کو قرآنِ حکیم تنبیہہ کرتا ہے کہ:

لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ كَبُرَ	تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جس پر تم خود عمل
مَقْتًا عِندَ اللَّهِ	نہیں کرتے۔ یہ اللہ کے نزدیک بہت

بڑا گناہ ہے۔

اصلاحِ معاشرہ کے لئے ایک اور اصول قرآن حکیم میں یہ بیان ہوتا ہے کہ لوگوں کو خیر خواہی کے جذبہ اور موعظۃ حسنہ (اچھی نصیحت) کے ساتھ سمجھاؤ۔ انہیں اصلاح کیطرف راغب اور متوجہ کرنے کے لئے ان کے ساتھ اچھے طریقے پر دلیلیں قائم کرو اور بحث کرو۔ کیونکہ کج بحثی اور کٹ حجتی سے بجائے فائدہ پہنچنے کے الٹا نقصان پہنچ جاتا ہے۔

اصلاح معاشرہ کے لئے اسلام اپنا ایک قانونی نظام بھی رکھتا ہے۔ قانون ایک ایسی ناگزیر ضرورت ہے کہ اس کے بغیر متمدن انسانی معاشرہ کا تصور ممکن نہیں۔ قانون کے ذریعے معاشرہ کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ حقوق کا تحفظ ہوتا ہے۔ فرائض ادا کئے جاتے ہیں۔ عدل و انصاف کے تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ معاشرہ کے افراد جو مختلف پیشوں اور حیثیتوں کے حامل ہوتے ہیں، ایک نظام کے تحت قانون کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہیں تاکہ ایک دوسرے کے ظلم و ستم سے محفوظ رہیں۔

دراصل انسانی زندگی کے تقاضے اس قدر گوناں گوں اور اس کی ضروریات اس قدر متنوع ہیں کہ معاشرہ کو ایک مضبوط قانونی نظام پر قائم کئے بغیر ان کی تکمیل نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ مگر یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے، جبکہ معاشرہ کا ہر فرد اپنے دل میں قانون کا احترام اور اس کی پیروی کا جذبہ رکھتا ہو۔

قانون کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک عمومی اور دوسرا خصوصی۔ عمومی سے میری مراد وہ قوانین ہیں جو کوئی حکومت ملک کے عام نظم و نسق، امن و امان اور معاشرہ کو انتشار اور افراتفری سے محفوظ رکھنے کے لئے وقتاً فوقتاً بناتی ہے۔ ان قوانین کا اطلاق بلاتخصیص مذہب و ملت مملکت کے تمام باشندوں بلکہ غیر ملکیوں پر بھی یکساں طور پر ہوتا ہے۔ مملکت کے نظام کو مساوی اور عادلانہ بنیادوں پر چلانے کے لئے تمام شہریوں بلکہ غیر ملکیوں کے لئے ان سب قوانین اور ہدایات کا احترام ضروری ہے۔ اس میں اسلامی نقطۂ نظر سے صرف ایک ہی استثناء ہے، وہ یہ کہ قوانین اور احکام اللہ کی معصیت پر مبنی نہ ہوں۔

"لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ"

"مخلوق پر کسی ایسے امر کی اطاعت واجب نہیں جس میں اس دنیا کے پیدا کرنے والے کی معصیت ہوتی ہو"

قانون کا خصوصی پہلو، جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے اور اس سے میری مراد قانونِ شریعت ہے جو کتاب و سنّت کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ پہلو اس وقت ہماری خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔

اسلام بنیادی طور پر قانون کی حرمت و بزرگی اور اعزاز کا قائل ہے اور اس کی پیروی پر بڑا زور دیتا ہے۔ ایک مسلمان کی زندگی، اسلام کے نظریہ کے مطابق ایک خاص قسم کے قاعدہ قرینے، نظم و ضبط اور آئین و قانون کے تابع ہے۔ خواہ زندگی کا عبادتی پہلو ہو یا معاملاتی۔ چنانچہ سورۃ النساء کی ۶۴ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

"ہم نے جو پیغمبر بھیجا ہے، اس لئے بھیجا ہے کہ خدا کے فرمان کے مطابق اس کا حکم مانا جائے"

اگلی آیت میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝

"تمہارے پروردگار کی قسم، یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کر دو اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اس کو خوشی سے نہ مان لیں اس وقت تک مومن نہ ہوں گے"

مطلب یہ ہے کہ جو قاعدے اور ضابطے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہم تک پہنچے ہیں ان کو جان و دل سے مانیں اور ان پر عمل کریں، ہم تب ہی صحیح معنی میں مومن کہلانے کے مستحق ہوں گے۔

ہو سکتا ہے کہ کسی قانون یا قاعدہ کی حکمت اور بھید ہماری عقل و فہم میں نہ آئے لیکن محض اس بنا پر کہ وہ ہماری عقل و فہم میں نہیں آیا، اس کے ماننے اور پیروی کرنے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سورۂ احزاب کی ۳۶ ویں آیت میں احترامِ قانون کے بارے میں پھر ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ

اور کسی مومن مرد اور مومنہ عورت کے لئے یہ سزاوار نہیں کہ جب اللہ اور اس

يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ" کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کردیں تو اب ان مومنوں کو ان کے معاملات میں کوئی اختیار باقی نہیں ہے"

مطلب یہ ہے کہ جو امور اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے فیصل شدہ ہیں، وہ قانون کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں اختلاف یا انحراف کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ ان قوانین کا احترام کرے اور ان کی پوری طرح پیروی کرے۔

بعض اصحاب کا خیال ہے کہ اسلامی قوانین کے نفاذ سے پہلے اصلاح معاشرہ ضروری ہے اس کے بعد اسلامی قوانین نافذ کئے جائیں ورنہ یہ موجودہ معاشرہ پر ظلم کے مترادف ہوگا۔ مجھے اس رائے سے اختلاف ہے۔ اگر معاشرہ کی اصلاح اسلامی قوانین کے نفاذ سے قبل ہی ہوسکتی ہے تو پھر اسلامی قوانین کے نفاذ کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے؟

قانون بجائے خود اپنے اندر اصلاح کی قوت رکھتا ہے۔ وہ قوت اگرچہ سلبی (Negative) طور پر اثر انداز ہوتی ہے لیکن بالآخر اس کا نتیجہ ایجابی (Positive) ہوتا ہے۔ اس لئے اسلامی قوانین کو اصلاح معاشرہ تک مؤخر کرنا اسلامی قوانین کی قوت اصلاح سے انکار کرنے کے مرادف ہے۔ حالانکہ اسلامی قانون جن حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے وہ حکمتیں اور مصلحتیں ان مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ہیں جن کا مطالبہ ہمارا موجودہ معاشرہ ہم سے کر رہا ہے۔ فی الحقیقت یہ خیال ان لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام صرف چند عبادات اور اسلامی قوانین صرف حدود و تعزیرات کا نام ہے۔

یہ خیال دراصل اس انگریز کی حکمت عملی سے ہمارے ذہنوں پر مسلط کیا گیا ہے جس کی غلامی سے سیاسی طور پر تو اگرچہ ہم آزاد ہو چکے ہیں لیکن فکری اور ذہنی طور پر ابھی آزاد ہونا باقی ہے۔ انگریزوں نے اسلام کو سرنگوں اور برباد کرنے کی جو منظم کوشش اور سازشیں اس برصغیر میں اپنے دور اقتدار میں کی ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا جو کہ آج ہم اور آپ دیکھ رہے ہیں۔ ان کو مسلمانوں کی طرف سے شدید مزاحمت کا خطرہ تھا اس لئے انہوں نے چند مخصوص عبادات نماز روزہ وغیرہ میں مسلمانوں کو آزاد چھوڑ دیا۔ چونکہ ہم نے اسلام کا عمل دخل اپنی زندگی میں صرف ان عبادات تک محدود دیکھا، اس لئے صرف اس کو اسلام سمجھ بیٹھے۔

اسلامی قوانین کے ساتھ ساتھ اسلام کا عدالتی نظام بھی نافذ کرنا ضروری ہے اور اس

باقی صـ۲۶ پر